

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے  
حکمران ہے اک وہی باقی بتانِ آذمہ

فُتْران کی رُوسے

# کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں

۱۹۷۹ء  
جشن نزول قرآن کی تقریب منعقدہ اگست ۱۹۷۹ء  
پرویز صاحب کا خطاب



عَشَاوًا وَآلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲) — اور وہ اس آتش خاموش و پنهان میں جلتے جھلتے رہتے ہیں۔

زمانہ نزول قرآن میں دنیا میں انسان کی جسمانی بیماریوں کے لئے تو سب سے الفاظِ راجح تھے لیکن دل کی بیماریوں کے لئے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی۔ اور اصل یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بھی ان بیماریوں کا کوئی خاص تصور متعین نہیں ہوا تھا۔ — حسد، کینہ، منافقت، مکاری، فریب کاری، خود غرضی، مفاد پرستی، دنایت وغیرہ کو اخلاقی بُرائیاں سمجھا جاتا تھا۔ انہیں امراض سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے انہیں "امراضِ قلب" کہہ کر بکار دیے۔ چودہ سو سال بعد جب نفسیاتی تحقیقات کا دائرہ وسیع اور قدر سے عینی ہوا تو یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ بُرائیاں اور خباثتیں درحقیقت نفسیاتی امراض (PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) ہیں۔ یہی وہ امراض ہیں جن کے علاج کے لئے قرآنی نسخہ کو "شِفَاءُ لِنَافِثِ الصُّدُورِ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر صرف اس ایک حقیقت پر ہی غور کیا جائے تو وحیِ خداوندی کی اہمیت اور قرآن مجید کی عظمت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اب آگے بڑھیں اور قرآن کریم میں پیش کردہ دوسری بنیادی حقیقت کو سامنے لائیے۔ علماءِ علمِ النفس سا لہا سال کی تجسس و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان نفسیاتی امراض کی علامات اور ان کے نمودار ہونے کی شکلیں اور صورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ یعنی خوں کا خراب ہونا۔ خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو، ان کے دل کی گہرائی

## نفسیاتی امراض کا بنیادی سبب

میں (یعنی اس کے لا شعور میں) پیوست ہو کر اس کی ذات میں لگا کر پیدا کر دیتا ہے جو مختلف نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر ان کے لا شعور سے خوف کے احساس کو دور کر دیا جائے تو ان امراض کو شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر تفصیل سے عرض کروں گا، قرآن ہی کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو طے بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسلام سے پہلے تین مذاہب عالمگیر حثیت رکھتے تھے (۱) بدھ مت (۲) عیسائیت، جس میں اصل کے اعتبار سے یہودیت بھی شامل تھی اور (۳) ایمان کی مجوسیت۔ بدھ مت، میں اصولی تعلیم یہ تھی کہ دنیا کرب اور اذیت (PAIN) کا گہوارہ ہے۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور گناہ (SIN) لازم و ملزوم ہیں۔ اور مجوسیت کا فلسفہ یہ تھا کہ دنیا میں خیر اور شر کی جنگ جاری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :-

اسلام نظامِ فطرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موافقات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلہ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔ ... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات لامنتہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ (آگے چل کر اقبالؒ کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر بُرائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL, PP. 34-37)

اقبالؒ کا سارا پیغامِ مستزادِ مجید کی روشنی میں انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ کر کے اس کے دل میں خوف

خوف کے خلاف جہاد کے احساس کو مثا دینا ہے۔ بالفاظ دیگر اقبالؒ کا پیغام خوف کے خلاف مسلسل جہاد ہے۔ مثلاً وہ اپنی مثنوی ”موزی بے خودی“ میں لکھتے ہیں :-

ہر شہر بہارِ بند قلبِ شست      اصل او بیم است اگر بینی درست  
لاہر و مدینہ      این ہمہ از خوف می گیرد مندوخ  
پردہ زرد      قلند را آغوشش مادر دامنش  
آنکہ از بیم نہام      می شود خوشنود، پانا سازگار

مصطفیٰؐ فہمیدہ است

موزی بے خودی ص ۱۱۰-۱۱۱

خوف مضمر دیرہ است

ت کے اندر کس با ح مضمر ہوتا ہے اور      حمت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔ سرپرست یہ دیکھئے کہ ظہور اسلام سے پہلے خوف کی وجہ سے انسان کی حالت کیا ہو چکی تھی۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ ہیں :-

بود ان در جہاں انساں پرست      ناکس و نابود مند و زیر دست  
سطوت کمری و تیہر رہن نش      بندہ در دست و پاؤ گردنش  
کاہن و پاؤ سلطان و امیر      بہر یک بچیر بسد بچیر گیسر  
صاحب اورنگ و ہم پرکشت      باج برکشت خراب او لوشنت  
در کلیسا استفت رسول قروش      بہر این صید زبول داسے بدکش  
از غلامی فطرت ادوں شدہ      لعنہ ہا اندر نئے اوخوں شدہ

(موزی بے خودی ص ۱۱۱)

اسلام کے وقت نورِ انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا اور ہمیشہ اذیت کے غصب ناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا تھا کہ رسالتِ محمدیؐ نے: **يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَثَرِ كَانَتْ عَلَيْهِمْ** (یہ) قرعوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہاتھوں کی ان بندھنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بال ہی کے الفاظ ہیں :

تا اینے شی بختا راں سپرد      بندگاں را مستر خاقان سپرد  
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد      کوہن را پاسیہ پر دینہ داد  
قوتیاد ہر کہن پسیر کشکست      نورِ انساں را حصایہ تازہ بست  
تازہ چال اندر تن آدم دمید      بندہ را باز از خدا و نداں حسدید

(موزی بے خودی ص ۱۱۲-۱۱۹)

قرآن کریم اس انقلاب آفرین پیغام اور انسانیت ساز و حریت بخش تعلیم کا حاصل چار ایسے الفاظ میں بیان کر دیا ہے جن کی جامعیت انسان کی بصیرت و حد کرتے لگ جاتی ہے۔ فرمایا: **فَمَنْ شِيعَ هَذَا آتَى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (یہ) جو لوگ ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف و اٹنگیر ہوگا نہ حزن۔ قرآن کریم نے یہاں دو الفاظ استعمال کئے ہیں — خوف اور حزن — معنویت کے اعتبار سے ان

## خوف و حزن

دونوں میں ایسا لطیف فرق ہے جسے دیدہ بینا ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں خوف کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ اُس خطرہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ ہم سانپ سے ڈرتے ہیں۔ شیر سے خوف کھاتے ہیں۔ لیکن حزن دل کی اس درد انگیز افسردگی اور اندوہناک آرزو کی کانام ہے جسے ہم نہ کسی کو دکھا سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے۔ اور اکثر اوقات تو اس کا کوئی محسوس سبب خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔

قرآن مجید کے انگریزی تراجم میں خوف کا ترجمہ (FEAR) اور حزن کا (GRIEF) کیا جاتا ہے۔ ذہنی طور پر تو ان الفاظ سے کام چل جاتا ہے لیکن حزن سے جو چوٹ دل پر پڑتی ہے وہ ابھیر کر سامنے نہیں آتی۔ ہمارے ہاں کی شاعری (یا مخصوص تغزل) کا چوتھا محبوب تریں موضوع حزن و ملال ہے اس لئے اس میں اس قلمی اضطراب کا اظہار مختلف انداز سے کیا جاتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کا ایک بڑا دلچسپ و عمیق شعر ہے جس میں انہوں نے خوف اور حزن کے فرق کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

صدائے تیشہ کہ سرنگی محو درگاہت خبر بگیر کہ آواز تیشہ و جگر است

جب تیشہ چٹان پر پڑتا ہے تو اس کی آواز میں اور جب وہ جگر پر پڑتا ہے اس کی صدا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمارا ایک اردو غزل گو شاعر اس فرق کو ذرا شوخ انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

کسے بتائے کوئی خون آرد و کیا ہے انہیں یہ صند ہے کہ دکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خوف کا مشاہدہ رنگ و بو سے ہوتا ہے اور حزن کا احساس ”خون آرد“ سے۔ خون آرد کا کسی دوسرے کو دکھانا تو ایک طرف جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، بعض اوقات تو ان کو خود بھی پتہ نہیں چلتا کہ میری افسردگی اور آرزو کی جو میری چربیاں کو حزن بنا دیتی ہے اس کا سبب کیا ہے جگر اس قسم کے انجانے غم کے متعلق کہتا ہے کہ

وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

یہ کیوں ڈوبا جا رہا ہے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ہے حزن۔ علی دنیا میں خوف اور حزن کے فرق کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک مستبد حکمران اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی ریشہ سے باز نہ آئے تو اس تلوار کو دیکھ لو۔ اس سے اس کے دل میں خوف پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے فلاں درگاہ پر ایک منت مانی تھی جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ اب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا معلوم مجھ پر کون غضب نازل ہوگا۔ یہ حزن ہے۔ وسیع معنی میں یہ سمجھو کہ انسانی حکمرانی کی طرف سے محکوم انسانوں کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں، اسے خوف سے تعبیر کیا جائے گا اور

ارباب شریعت اور اصحاب طریقت جس قدر خداوندی سے ڈرتے رہتے ہیں وہ حزن کہلائے گا۔ قرآن کریم نوع انسان کو ان ہر دو سے نجات دلانے کی ضمانت دیتا ہے۔ جب انسانوں کو اس ڈر (خوف اور حزن) سے نجات مل جائے گی تو ان سے پیدا شدہ امراض (نفیاتی پیچیدگیوں) سے شفا حاصل ہو جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن اس خوف اور حزن کو دور کس طرح کرتا ہے؟ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بعض انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں تو محکوموں کے دل میں خوف اور حزن پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی حکمران انسانوں کے جموں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور مذہبی پیشوا ان کے قلب و دماغ پر۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس کا علاج بنا دیا ہے۔ — محاورہ کے طور پر نہیں۔ — سچ مح و فقط میں۔ اور وہ دو لفظ ہیں۔ — لا الہ — الہ کے معنی ہیں صاحب اقتدار۔ وہ جسے حق حکومت حاصل ہو۔ لہذا لا الہ



## لا الہ

اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات میں کوئی صاحب قوت ایسا نہیں جسے دوسرے ان لوگوں پر حق حکومت حاصل ہو۔ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، وہ جن قوانین کے تابع سرگرم عمل ہے، کوئی قوت ایسی نہیں جو ان قوانین کی نگہ اپنے قوانین نافذ کر سکے، یا ان میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ لہذا، خارجی کائنات میں لا الہ کا عمل از خود کار فرما ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نقطۂ ادوار عالم، لا الہ انتہائے کاب عالم، لا الہ

صنعت را از دور او گردندگی مہر را پائندگی، رخشندگی

بجز گوہر آفرید از تاب او موج در دریا پدید از تاب او (مؤید خودی ص ۱۶)

یہ مسلک خارجی کائنات کا ہے۔ انسانی دنیا میں ان لوگوں پر ان حکومت کرتے ہیں۔ اگر انسان اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ لا الہ — کسی ان کو حق حکومت حاصل نہیں، تو وہ خوف و حزن سے مامون ہو جائے گا۔ لہذا، خوف و حزن سے نجات پانے کے پروگرام کی منزل اول یہ ہے کہ لا الہ کو اپنے دل کا یقین اور زندگی کا معمول بنایا جائے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

در جہاں آغاز کار از حرف لا ست این نخستین منزل مرد خدا مست

پیش غیر اللہ لا گفتن چیستا تازہ از ہنگامہ اد کائنات

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ تخم لا در مشت خاک او بریز

پر کرا این سوز با شد در جگر ہوش از ہول قیامت بیشتر

لا مقام ضرب بلے پے بہ پے این غو بعد است نے آواز سے

(پس چاہیہ کرد ص ۱۹)

اگے چل کر وہ ادبائے شریعت اور اصحاب طریقت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

ایک اندر حجرہ با سازی سخن نعرۂ لا پیش نمود سے نبر

ایک می بینی، نیر نہ بادو جو از حلال لا الہ آگاہ غلو

ہر کہ اندر دست او تمیز لا ست جملہ موجودات را فرما زواست (ص ۱۳)

## مردِ حر

لا الہ کو مسلک زندگی قرار دے لینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے، اور اقبالؒ اسے **مردِ حر** کہتا ہے۔ یعنی وہ جو خوف و حزن سے آزاد ہو۔ مردِ حر کے متعلق وہ کہتے ہیں :-

مردِ حر از لا الہ روشن ضمیر می نہ گردد بندہ سلطانِ دیر

ماکیسا دوست، ماسجد فروش از دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

داد اند سینہ تجسس امم در جبین او ست نقدِ ہر ام

در جہاں بے ثبات اور ثبات مرگ اور از مقامات حیات (ایضاً ص ۳۲)

جاوید نامہ کے آخر میں انہوں نے (جاوید کی وساطت سے) ہماری نثار و لو کو ایک پیغام دیا ہے۔ پیغام کیا ہے ؟

صویر اسرائیل ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

اے پسرا دوق نگہ از من بگید جوختن در لا الہ از من بگید

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَنَّى الْجُودُ رُسُيْ جَاں  
 ایں در حریت لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ نیست  
 تا ز اندام تو آید بوسے جَاں  
 لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جز تیغ بے ز نہار نیست  
 ز نیستی با سوز او تباری است  
 (احمدیہ نامہ ص ۲۳۳)

اقبال نے کہا ہے کہ

ایں در حریت لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ نیست  
 لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جز تیغ بے ز نہار نیست

صدر اقل کے مسلمان (یعنی مردانِ حُر) اس حقیقت کو کس طرح سمجھ چکے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جو کتبِ دیات میں گویا ہر تاجدار کی طرح تابندہ ہے۔ جب نبی اکرمؐ کی مکتی زندگی میں قرآنی انقلاب کے امکانات بعید سے نظر آنے لگے تو انصارِ مدینہ کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پیش کش کی کہ آپؐ مدینہ تشریف لے چلیے کہ وہاں کی فضا اس انقلاب کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ آپؐ نے اس تجویز پر اظہارِ رضامندی فرمایا اور ان سے کہا کہ آپؐ اس امر کا عہد کریں کہ اس عہد کے عجب کے خلاف اعلانِ جنگ

راستے میں کتنی مشکلات بھی کیوں نہ پیش آئیں آپؐ اس دعوت کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کی پختی کی علامت کے طور پر آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کرنا شروع کیا (بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم اس مقصد کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ آپؐ کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں) اس وفد کا سربراہ دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ آپؐ لوگ یہ عہد تو کر رہے ہیں لیکن آپؐ نے اس کے مستلح اور عواقب پر بھی غور کر لیا ہے؟ یہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر یہ عہد کر دو۔

آپؐ نے دیکھا کہ وہ حضرات لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مفہوم کس واشگاف انداز میں سمجھ چکے تھے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے یہی مضمرات ہیں جن کے پیش نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

تجود تو برا منہ دزم نگہ را کہ بنیم اندر دین مہر و را

چرخ گویم مسلمانم، بلزلم کرد اغم مشکلات لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (ارضانِ حجاز ص ۲)

اُس در میں اس عہد کا نام ایسا تھا جسے قرآن کریم میں اِنِ الْفَاطِمِیْنَ بیان کیا گیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ امْتَدَّ ذٰلِیْ سِنِ الْمُوْمِنِیْنَ اَلْفَھِمْ وَ اَمُوْا اَنْھُمْ بِاَنَّ لَھُمْ الْجَنَّةَ (۱)۔ اس ایمان کی رو سے مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا تھا اور خدا اس کے عوض اسے جنت عطا کر دیتا تھا۔ وہ جنت جس کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا جاتا تھا کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ وَلَا اَحْزَامٌ تَحْزُنُوْنَ (۲)۔ اس میں تمہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ اس سے آپؐ اندازہ لگا لیجئے کہ ایمان کے اس جزِ اقل کا عملی مفہوم کیا تھا یہ ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔

نہ ہر کس مست تا ز اندر نیاز است نہ ہر کس خود گر دہم خود گداز است

قبلے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تباری است کہ بر بالائے نامرداں دوازا است (ارضانِ حجاز ص ۲)

یہاں تک یہ بتایا گیا ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جسے حق حکومت حاصل ہو۔ لیکن ان لوگوں کی تمدنی زندگی کے لئے حکومت کا وجود ناگزیر ہے۔ حکومت کے معنی ہیں ایسی پابندیاں عائد کرنا جن سے افراد معاشرہ کے

بہی روابط عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار اور حکم ہوں مگر معاشرہ میں ایسی پابندیوں کا اندازہ کی جائیں تو اس میں اتار کی پھیل جائے گی۔ فساد پر یا ہو جائے گا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے اس ایمان کا دوسرا جز الا اللہ اس کے ساتھ پیوست **الا اللہ** کر کے توحید کے پروگرام کی تکمیل کر دی۔ لا الہ الا اللہ - یعنی دنیا میں خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اس کا پہلا حصہ اگر ہر وقت کی نفی کرتا ہے تو دوسرا حصہ خدا کے حق حکومت کا اثبات ہے۔

در مقام لایا ماید حیات سوئے الای خدا مدامد کائنات

لاوالا سازد برگ اُمتان نفی بے اثبات برگ اُمتان (سچہ باید کرد ص ۳۳)

قرآن کریم نے اس پورے ناز سے کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا جب کہا: **الَا اَلَسْ اَآءِیَ الْبَدِیْنِ** "کون سا نظام زندگی اختیار کیا جائے؟ اس باب میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔ **قَسْرَ لَیْسَ بَیْنَ الشُّرَکَیْنِ الشَّدُّ مِنْ الْعَقْرِ** - صحیح راستہ اور غلط راہ کھڑ کر سامنے آ چکی ہیں۔ صحیح راہ خدا کی حکمرانی ہے اور غلط راہ انسانوں کی حکمرانی۔ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِلَٰهَ غَوٰتٌ وَّیَلُوفٌ مِّسْرٌ بِاللّٰہِ** **نَقَدْنَا مَنَکَلَنَا یَا لَعْنَةُ ذُو الْاَوْثَاقِ لَا اِنْفِصَامَ لَہَا دِیْمٌ** - جس نے انسانوں کی حکمرانی سے انکار کر کے خدا کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا تو اس نے ایسے سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

**خدا کی عبادت** حکمرانی کے لئے عربی زبان اور قرآن کریم میں "عبادت" کی اصطلاح آئی ہے۔ "خدا کی عبادت" کے معنی میں خدا کی حکومت اختیار کرنا یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم کے افتتاحیہ

(یعنی سورہ فاتحہ) میں دو لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ اسے ایک عبد مؤمن نماز کی ہر رکعت میں دہراتا ہے جب وہ (یوں کہتے کہ) یا وضو، یا نماز، یا کھڑے ہو کر اور قبیلہ کی طرف منہ کر کے اپنے خدا سے کہتا ہے کہ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

ہم تیری اور صرف تیری حکومت اختیار کرتے ہیں۔ یہ لا الہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہے۔ یہ اعلان کس طرح عرب اور عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے اسے اقبالؒ نے ایک شعر میں یوں سمٹا دیا ہے کہ

ناد و تیغ لا والا داشتیم ماسوا اللہ رائشاں نگذاشتیم (ساز ص ۳۳)

جب ہمارے ہاتھ میں لا اور الا کی تلواریں تھیں تو ہم نے اللہ کے سوا ہر حکمران کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ خدا کا ہر رسول **حضرت موسیٰ** ایسی انقلابی پروگرام لے کر آتا تھا جب حضرت موسیٰ کو طور کی چوٹی پہ پہلی بار پکارا گیا تو ان سے کہا گیا: **اَسْمِعْنِیْ اَنَا اللّٰہُ** ہم اللہ ہیں۔ **لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا** ہمارے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ **فَلْعَبَدْتُ**

(چیل)۔ لہذا تم ہماری اور صرف ہماری حکومت اختیار کرو اور یہی پیغام لے کر فرعون کی طرف جاؤ جو اپنی حکمرانی کا سب سے بڑا عویذ تھا، خدا کا سرکش ہے۔ یہی وہ پیغام تھا کہ جسے ایک اور فرعون کے عہد حکومت میں حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں کو ان الفاظ میں دیا تھا: **اِنَّ الْکَلِمَۃَ الْیَاسَیَۃَ** - اس نے ہم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کرو۔ کسی اور کو نہیں۔ **اَمْہَسْ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا یَاۤہُ** - اس نے ہم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کرو۔

**قَالَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفَیْقَمَ** - یہی حکم نظام ہے۔ **وَلَکِنْ اَکْثَرُ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ** (س ۳۳) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جھک کر اپنے لئے ذلت و خواری کا ملان پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی انقلاب آفرین پیغام لے کر حضور نبی اکرمؐ تشریف لائے اور ماری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ **اِنَّہَا اُحْسَرَتْ اَنْ اَعْبَدَ اللّٰہُ**



وَلَا أُشْرِكُ بِهِ (۱) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدا کی حکومت اختیار کر لوں اور اس کے حق حکومت میں کسی کو شریک نہ کروں۔ یا وہ کہے: خدا کی حکمرانی سے یکسر انکار کر کے سیکولر نظام اختیار کر لینا کفر ہے۔ اور خدا کے نام سے انسانوں کے وضع کردہ قوانین نافذ نہ کرنا شرک ہے۔

قریش مکہ نے حضور کی دعوت کی جس قدر مخالفت کی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ یہ بات مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کبھی وضاحت سے سامنے نہیں لائی جاتی۔ کہا جاتا ہے تو صرف انشا کہ حضور ان کے بتوں کو برا کہتے تھے اور یہ چیز انہیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اقل تو یہی بات صحیح نہیں کیونکہ دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر وجہ نزاع یہی تھی تو ہجرت کے بعد قریش نے اس قدر لٹائیاں کیوں لڑیں؟ حقیقی وجہ نزاع وہ تھی جسے قرآن کریم نے اعلان جنگ قرار دیا ہے اور اسے ایسے زلزلہ انگیز انذار میں دہرایا ہے جس سے دلوں کی بستی ٹک میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یٰوایا! قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكَافِرُونَ يٰۤاَيُّهَا الْكَافِرُونَ یہ لوگ جو خدا کی حکمرانی سے انکار کرتے ہیں اے رسول! انہیں یہ الٹی میٹم دے دو کہ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ۔ جن قوتوں کی حکومت تم اختیار کئے ہوئے ہو میں بھی ان کی حکومت اختیار نہیں کروں گا۔ وَلَا اَسْتَعِزُّ بِعِبَادِكُمْ مَا تَعْبُدُونَ۔ اور تمہاری موجودہ رکش سے ظاہر ہے کہ جس خدا کی حکومت کی میں دعوت دیتا ہوں تم اسے آسانی سے اختیار نہیں کرو گے اور

### قریش مکہ کے خلاف اعلان جنگ

مجھے مجبور کر دے کہ میں اپنی اس دعوت کو چھوڑ کر تمہارا مسک اختیار کر لوں۔ لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وَلَا اَنَا عِبْدُ مَا عَبَدْتُمْ وَلَا اَسْتَعِزُّ بِعِبَادِكُمْ مَا تَعْبُدُونَ۔ جس طرح تم میری دعوت کو قبول نہیں کرو گے میں بھی تمہارا مسک اختیار نہیں کروں گا۔ یہ میری طرف سے کھلا کھلا اعلان جنگ ہے۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۲) تمہارا نظام زندگی تمہارے لئے اور میرا نظام زندگی میرے لئے اس لئے تم میں اور مجھ میں نہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان دونوں نظاموں میں کوئی قدر مشترک نکل سکتی ہے۔

ان آیات اور ان جیسی سیکڑوں دیگر آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اِيَّاكَ

تَعْبُدُ اسلام کی اساس اور بنیاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ہمارے سامنے نہیں آتا اس لئے اس کی حکومت اختیار کس طرح کی جائے؟ اس کے جواب میں بھی قرآن کریم نے حکومت کا ایسا تصور پیش کیا جس سے اُس زمانے کا انسان قطعاً نا آشنا تھا اور اب بھی رفتہ رفتہ اس تک پہنچ رہا ہے۔ اس زمانے میں حکومت صرف اشخاص کی سمجھی جاتی تھی۔ اشخاص کے بدلنے سے حکومتیں بدل جاتی تھیں لیکن قرآن کریم نے کہا کہ حکمرانی اشخاص کی نہیں بلکہ قانون کی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ایک ضابطہ قوانین دیا ہے۔ اس ضابطہ کی حکومت

قانون کی حکمرانی اختیار کی جائے گی تو وہ خدا کی حکومت ہوگی۔ چنانچہ اس نے فرمایا: اِنَّا اَسْزَلْنَا اَيُّكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔ فَلْيَعْبُدِ اللّٰهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (۳) اے رسول! ہم نے تیری

طرف اس ضابطہ قوانین کو نازل کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے خالصتاً اس ضابطہ کی اطاعت کرو۔ یہی خدا کی عبادت یعنی حکومت ہوگی۔ دوسری جگہ کہا: اَفَعْبُدُ اللّٰهَ اَتَتَّبِعِيْ حَكْمًا ۚ وَهُوَ الَّذِيْ اَمْدَدَكَ بِكُلِّ

اَلْكِتَابُ مُفَصَّلًا (۱۶) ”میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا مفصل ہے۔“

چنانچہ نبی اکرمؐ نے وہ اسلامی نظام قائم فرمایا جس میں لوگوں کے معاملات کے قیصلے کتاب اللہ کے مطابق کئے جاتے تھے کیونکہ حضورؐ سے کہا گیا تھا: فَاتَّخِذُوا مِنْ كِتَابِي حُكْمًا مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ (۱۷)۔ حضورؐ خود اسی کتاب پر ایمان لائے تھے (۱۸) اور اسی کا اتباع کرتے تھے۔ (۱۹) اس کتاب عظیم کی خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر خصوصیات بیان کی ہیں کہ اس خطاب میں ان کا عصر ناممکن ہے۔ ان میں سے چند ایک کے عنوان اس قدر پیش خدمت ہیں :-

## فُتْرَان کی خصوصیات

- (۱) وحی خداوندی تمام کی تمام قرآن کے اندر حضورؐ ہے اور یہی حضورؐ کے فی طبعین اور بعد میں آنے والوں کے لئے ضابطہ ہدایت تھی اور ہے۔ (۲۰) یہ ناممکن تھا کہ اس کا کوئی ایک لفظ بھی چھوٹ گیا ہو (۲۱)۔
- (۲) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی اس لئے ساری دنیا کو جیلنج دے دیا گیا تھا کہ اس کی مثل ضابطہ حیات مرتب کر کے دکھاؤ (۲۲)۔
- (۳) یہ اپنی ہر بات کو نکھارا اور اُتھا کر بیان کرتی ہے اس لئے اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ (۲۳) (۲۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۲۵) اس لئے جو لوگ اسے ضابطہ حیات تسلیم کریں گے ان میں بھی نہ باہمی اختلاف ہوگا نہ تفرق۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۲۶)۔
- (۴) یہ ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ سورۃ الانعام میں ہے: وَ كُنْتُمْ كَلِمَةً ثُمَّ كُنْتُمْ عِدَّةً لَا تُبَدِّلُ وَلَا يُغَيِّرُ (۲۷)۔ جب قوانین خداوندی اس کتاب میں مکمل طور پر دے دیئے گئے ہیں۔ ان میں نہ حکم و اضافہ کیا جاسکتا ہے نہ تغیر و تبدل۔ اور تو اور خود رسول اللہ کو بھی اس کا اختیار نہیں تھا کہ اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکتے۔ سورۃ یونس میں ہے کہ حضورؐ کی دعوت کے مخالفین آپ سے کہتے کہ ہم آپ سے معاہدہ کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس قرآن کی جگہ کوئی اور قرآن لے آئیں یا کم از کم اس میں کچھ تبدیلی کر دیں۔ اس کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا: قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُصْبِحَ لَهُ مِنْ تِلْكَ اَنْفُسِي (۲۸)۔ رسولؐ ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ میں اس میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکوں۔ جب یہ کتاب میری تصنیف ہی نہیں تو میں تبدیلی کس طرح کر سکتا ہوں؟ اِنْ اَنْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ اِلَيْ (۲۹)۔ یہ تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں۔ اِنِّي اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رِفْقًا عَنَّا اَنْ يَكُوْفِرَ بِكُمْ عِظِمًا (۳۰)۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔
- (۵) اس کتاب کو مکمل اور غیر متبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (۳۱) اور تمام نوع انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری رہنمائی کے لئے کافی ہے (۳۲)۔ اس کی موجودگی میں تمہیں کسی اور راہنمائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
- (۶) اور اس کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کفر اور اسلام میں یہی ماہ الامتیاز ہے۔

وَمَنْ يُكْفِمْ دِيْنًا اُنْزِلْ اِلَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمَنْ يُكْفِمْ دِيْنًا (پھر)۔

جو لوگ اس کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے تو انہیں کا منہ کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ کتابِ مطہر جس کے متن اقبال؟ جہودِ جہود کر رہا ہے :

تو ہی دانی کہ آئین تو چیست ؟	زیر گردوں، ستر تکین تو چیست ؟
آن کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم	حکمتِ ادلا یزال است و قدیم
نسخہٴ اسرارِ تکوینِ حیات	بے ثبات از قوتش غیرِ ثبات
حرفِ اورا رب نے، تبدیل نے	آہِ اش شرمندہٴ تاویل نے
پختہ تر سو اس کے خام از زورِ او	و قد با سنگِ جام، از زورِ او
تو ہی انسانِ رہا ہم آخرب	حاصل او رحمتہ اللعالمین (اسرار و زندہ)

بات یہاں سے چلی تھی کہ ان کے تمام نفسیاتی امراض کی جڑ اور بنیادِ قوت ہے۔ خوفِ اللہ کی نگرانی سے پیدا ہونا چاہو وہ سیاسی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے پیکر میں۔ قرآنِ مجید ان کی حکومت کے تصور کو ختم کر کے خوف اور جہنم کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوگا جب انسان خدا کی کتاب کی ایسی محکومیت اختیار کرے جس میں اللہ کی حکمت اور جذبات کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس پورے پروگرام کو قرآن مجید نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے سمو کر بیان کر دیا جب کہا :-

مَا كَانَ لِبَشِيٍّ اَنْ يُّوْتِيَ اِلَهًا الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالشُّرُوءَ لَا تَشْعُرُ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُنُوْا عِبَادًا لِّيْ  
مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُنُوْا اَسْلٰبِيْنَ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلِكْتُبْ وَبِهَا كُتِبَتْ قُدْرَتُكُمْ

(پھر)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اس کی حیثیت مقصد کی ہو یا انتظامیہ کی حتیٰ کہ اسے موت کا منصب بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے ہی کہنا چاہیے کہ آؤ ہم اہم اور تم سب مل کر خدا کی کتاب کے اتباع سے اللہ کے محکوم بن جاؤ۔

اسی کو توحید کہا جاتا ہے جو اسلام یعنی نظامِ خداوندی کی اصل اور بنیاد ہے۔ توحید کا عملی مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی ہر انسانی حکومت سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی کتاب کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر لے تو اس کا لازمی نتیجہ مساوات، محکمیت اور آزادی ہوگا۔ اسلام  
دکسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبنیہ الوہیاتی اقتدار کو۔ (انگریزی خطبات ص ۱۱)  
وہ روزِ بے خودی میں توحید کے متعلق کہتے ہیں :-

دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو	زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو
تدرست ازو، برگزیت ازو، بندہ را	نور ازو، دیگر آفتاب ازو، بندہ را
بیم و شک میر و عمل گیر و حیات	چشم می بیند ضمیر کا منات
چوں مقام عسیدہ محکم شود	کاسہ در یوزہ جام جسم شود

کتاب اللہ کی حکومت میں خوف اور حزن کس طرح کا نور ہو جاتا ہے، ہمارے صدرِ اول کی مجموعہ تاریخ اس کی مثالوں سے عانتاب ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کر دوں گا جو واقعی لحاظ سے تو معمولی سی ہیں لیکن ہمارے مقصد پیش نظر کے اعتبار سے بڑی اہم ہیں۔ مدینہ میں برسہو نامی ایک لوتھی تھی جس نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے خاوند کی درخواست پر حضورؐ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو نہ چھوڑے، آپ سوچیے کہ یہ کہتے والا کون ہے اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ (ہمارے مروجہ تفسیر اور معیار کے مطابق) کس حیثیت کی مالک ہے؟ کہتے والا سربراہِ مملکت بھی ہے اور خدا کا رسول بھی، اور جس سے کہا جا رہا ہے وہ اس کی رعیت بھی ہے اور اس پر ایمان لانے والی بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی سفارش کے جواب میں اس نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے جسے آپ مجھ تک پہنچا رہے ہیں یا آپ کی اپنی سفارش؟ آپ نے فرمایا کہ یہ خدا کی وحی نہیں۔ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ پھر معاف فرمائیے میں آپ کا مشورہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں۔ ایسا کہنے سے تو اس کے دل میں ایک سربراہِ مملکت کی حکم عدولی سے کوئی خوف پیدا ہوا، اور نہ ہی خدا کے رسول کی معصیت کے احساس سے کس قسم کا حزن۔

دوسری مثال اس واقعہ کی ہے جس کی رو سے حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ چاہا کہ قبر کی کوئی انتہائی حد مقرر کر دی جائے جب انہوں نے اپنی اس تجویز کو مجمع کے سامنے پیش کیا تو ایک بڑھیا نے اٹھ کر کہا کہ عمرؓ خدا کا خوف کرو۔ خدا کا ارشاد تو یہ ہے کہ تم چاہو تو قبر میں سونے کا ڈھیر بھی دے سکتے ہو۔ تمہیں خدا کے اس حکم پر حزن کا اختیار کیسے حاصل ہو گیا؟ یہ سس کر سربراہِ مملکت نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور محذرت سے کہا کہ محترمہ! مجھے معاف رکھنا۔ قرآن کا یہ ارشاد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ بھی وہ جزائیں اور میہکائیں جو ان لوگوں کے دل میں توحید سے پیدا ہوتی ہیں۔



دکے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ واضح ہے قرآن کریم نے نظامِ خداوندی کا منہا یہ بتایا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا هُمْ يَخْشَوْنَ۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہو گا۔ لیکن قرآن مجید میں خدا کے خوف کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ خوف کے معنی کسی آنے والے خطرے کے احساس سے اس سختی طرہ سے ہونے کے بھی ہیں۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے ہاتھ جل جائے گا اور مجھے بڑی تکلیف ہوگی اس لئے مجھے آگ کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کے خوف سے یہ مراد ہے۔ یعنی اگر میں نے ان کی خلافت ورزی کی تو اس سے مجھے بڑا نقصان پہنچے گا۔ اس لئے مجھے بڑی احتیاط برتنی چاہئے۔ یہ احتیاط ہر قسم کے خوف سے محفوظ اور مأمون کر دیتی ہے۔ اقبالؒ نے خوف یا حزن کے ان سرد ووات میں بڑا نازک سا فرق بتایا ہے جب کہا ہے :-

یک غم است آن غم کہ آدم را خورَد آن غم دیگر کہ ہر غم را خورَد (ذہرِ غم ص ۲۵۴)

یعنی ایک غم وہ ہے جو ان کو کھا جاتا ہے (یہ ان کی حکومت کا خوف اور مذہبی پیشوائیت کا حزن ہے) اور دوسرا غم وہ ہے جو ہر غم کے غم کو کھا جاتا ہے (یعنی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ اسے تقدیر ہی کہتے ہیں) اس فرق کو

حفیظ ہو شیاہ پوری (مرحوم) نے غزل کے انداز میں بڑی دلکشی سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ  
 زمانے بھر کے غم، یا ایک تسما غم      یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے !  
 اور اقبال کے الفاظ میں :-

یہ ایک سجدہ ہے تو گراں سمجھتا ہے      ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو بچتا

خدا نے اپنی طرف نگاہیں بھی حزن کا لفظ منسوب نہیں کیا۔ خوف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، خوف،  
 قانون خداوندی کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے نقصان کے احساس کا نام ہے۔ خدا نے اپنے ہر قانون کے سلسلہ  
 میں وضاحت کر دی ہے کہ اس نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے۔ یعنی اس کی توجیہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے برعکس،  
 حزن، لاقانونیت کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کے احساس کو کہا جاتا ہے جس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور قانون  
 خداوندی کے برعکس، انسانوں کا وضع یا نافذ کردہ ہر قانون، عدالت خداوندی میں لاقانونیت کے زمرے میں آتا ہے۔



قرآن مجید کی اس پوزیشن کے تعین کے بعد آپ غور کیجئے کہ یہ نوع انسان کے لئے کس قدر حشرِ شہدِ رحمت بن جاتا ہے؟  
 آپ ایک قوم سے کہتے ہیں کہ اس کتاب کو دیکھئے۔ یہ ہمارے لئے آئینِ حیات اور ضابطہ قوانین ہے۔ آپ اسے دیکھئے  
 اور اچھی طرح پرکھئے۔ اگر آپ اس سے مطمئن ہوں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ وہ قوم آپ سے کہتی ہے کہ ہمارا اس  
 پر اطمینان تو ضرور ہے لیکن حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل کو کوئی اور حکومت آجائے اور  
 وہ اس میں رد و بدل کر دے۔ آپ اس سے کہتے ہیں اس میں یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر  
 سکتا۔ اس پر وہ کہتی ہے کہ یہ مانا کہ اس میں کوئی حکومت تبدیلی نہیں کرے گی لیکن کل کو کوئی نئی آجائے تو وہ تو اس  
 میں تبدیلی تو ایک طرف اس کی جگہ کوئی دوسرا ضابطہ قوانین لاسکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب وہ ہے جس نے مذہب  
 کی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ نبوت ختم کر دیا ہے اس لئے اب  
 کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ لہذا، یہ قرآن تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک کے لئے غیر متبدل  
**ختم نبوت** اور آخری ضابطہ قوانین رہے گا۔

ختم نبوت کا اعلان فی الواقعہ ایک عظیم انقلاب کا اعلامیہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :-  
 اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوت اپنی تکمیل کو  
 پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف  
 نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت کی ڈوریوں سے باندھے نہیں رکھا جاسکتا۔  
 انسان کو شعورِ خوشیش کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کی اپنی صلاحیتوں کے سہارا  
 پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے مذہبی مشواہت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید غور و فکر  
 اور تجربات و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسان کے ذرائع ٹھہراتا  
 ہے یہ سب ختم نبوت کے نظریہ ہی کے مختلف گوشے ہیں۔ . . . . عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت  
 یہ بھی ہے کہ اب نوع انسان کی تاریخ میں کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی فوق الفطرت اھٹاٹ



کی بنا پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نظریاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوے اتلہ کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ (پانچواں خطبہ۔ ص ۱۳)

وہ اپنے چھٹے خطبے کے خاتمے پر کہتے ہیں :-

اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزلو قوم ہونا چاہیے۔ (ص ۱۴)

عقیدہ ختم نبوت کی حکمت قرآن کے اس اعجاز پر ہے کہ اس کے اصول و اقدار میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کے بدلنے والے انسانی تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :

چل مسلمان اگر داری جبگر در ضمیر خویش در دست آن نگر  
صد جہان تازہ در آیات اوست عصر با پیچیدہ در آفات اوست  
یک جہانش عصر حاضر ایں است گیر اگر در سبز دل معنی رس است  
بندہ مومن ز آیات خداست ہر جہاں اند ہر ازل و قبل و بعد است

(جاوید نامہ۔ ص ۴۲)

چل کہن گر دو جہانے در برش

می وہ مستر آن جہانے یگرش

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس کتاب کا وارث قرار دیا (۳۱) اور ان سے کہا کہ جو اصول اور اقدار اس میں دیئے گئے ہیں ان پر عمل درآمد کے طور و طریق اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود طے کر لیا کرو (۳۲)۔ یہی حکم خود رسول اللہؐ کو بھی دیا گیا تھا (۳۳)۔ یہ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل درآمد کے طور و طریق، جو باہمی مشاورت سے طے پائیں، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلنے چلے جائیں گے۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے اس امتزاج سے حکومت خداوندی ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی۔

**اس کے بعد کیا ہوا ؟** اسلام کے صدراقل میں یہ حکومت اسی طرح قائم ہوئی تھی اس کے بعد کیا ہوا اسے آئیلا؟

کے ان بصیرت افروز الفاظ میں سنئے۔ وہ کہتے ہیں کہ

نقش قرآن تادری عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپاشکست (جاوید نامہ۔ ص ۹)

اس کے بعد اس قوم نے کیا کیا ؟

خود ملکیم قیصر و کسریٰ شکست خود میر تخت ملکیت نشست  
تاہنال سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملکیت گرفت  
از ملکیت ننگہ گرد و دگر

(جاوید نامہ ص ۱۱)

عقل و ہوش و رسم و رہ گرد و دگر

یعنی سب سے پہلے ہم نے وراثتی بادشاہت کو قائم کر لیا۔ ہماری تاریخ کی یہ بوجہی جہاں انتہائی حزن انگیز ہے وہاں اتنی ہی بڑی حیرت فرسٹش بھی ہے۔ یرید کے خلاف انتہائی سنگین جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے وراثتی بادشاہت کی طرح ظال کر اسلام کی حریم کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر تعجب انگیز ہے کہ یرید کے بعد ہماری تاریخ میں

تمام بادشاہتیں اسی طرح قائم ہوئیں جس طرح یزید کی بادشاہت کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اس میں ناقابل فہم اور انتہائی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جہند ہی پیشوا بیت یزید کے خلا و بیچرم عائد کرتی ہے، وہ اس کے بعد اسی انداز سے برسر اقتدار آنے والے بادشاہوں کے نام خطبوں میں پکارتی اور ان کے حق میں نایب و نصرت خداوندی کی دعائیں مانگتی چلی آرہی ہے۔ اور اس کے ساتھ فخریہ دعوے کیا جاتے ہیں کہ اس تمام دوران میں اسلام اپنی تابانیوں کے ساتھ مسلسل آگے بڑھنا چلا آ رہا ہے؟ سوچئے کہ کیا اسلام اور مودنی بادشاہتیں کبھی یکجا ہو سکتی ہیں؟

آپ کو شاید اس پر حیرت ہو کہ خدا کی حکمرانی کے متعلق قرآن کریم کے ایسے واضح ارشادات کی موجودگی میں الہی بادشاہت کو کیسے رد رکھا گیا؟ ہم نے دیکھا ہے کہ حکومت خداوندی کی بنیاد لایلہ الا اللہ پر تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کے متوازی حکومتیں

سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ انہوں نے اللہ کا ترجمہ معبود کیا اور معبود کے معنی بتائے جس کی پرستش کی جائے اس کے ساتھ ہی عبادت کے معنی بھی پرستش کر دیئے۔ لہذا، لا الہ الا اللہ کے معنی ہو گئے۔ خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی پرستش کی جائے اور آیات تعدید کے معنی یہ کہ ہم صرف تیری پرستش کرتے، یعنی پرستش خدا کی اور حکومت بادشاہوں کی! اور ان بادشاہوں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ "السلطان ظل اللہ علی الارض" بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ بادشاہوں نے اس کے معاوضہ میں یہ سمجھو نہ کر لیا کہ دنیاوی امور کے متعلق تو ہماری حکومت ہوگی اور امور شریعت کے متعلق مذہبی پیشواؤں کے احکام نافذ ہوں گے۔ یوں ایک مملکت میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں اور امت چکی کے ان دو پاؤں میں پستی چلی گئی اور ان کا قلب دعوت و حزن کا ماس بنتا چلا گیا۔ اس کے بعد آپ تحقیقاتی کمیشن پٹھانے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ قوم میں اس قدر اخلاقی زمام کیوں پیدا ہو گئے ہیں؟ صدیوں کے اس خوف و حزن کا نتیجہ اخلاقی زمام نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا؟

۵

یہ قرآن پر سیاسی حکومتوں کا تقاضہ۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی؟ یہ وہ مقام ہے جہاں پاؤں رکھتے ہوئے (معاذ سے کی زبان میں) فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے متعلق کسی معاملہ پر تنقید کیجئے تو اس پر غور و غنڈے دل سے غور کرنا تو دیکھنا وہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس پر کوئی بھی غور و فکر کی جرات نہ کر سکے۔ وہ اپنے شورا انگیز ریپبلکنڈے سے عوام کو اس طرح مشتعل کر دیتے ہیں کہ غور و فکر کی تمام گنجائشیں مسل کر رہ جاتی ہیں۔ میں آپ سے خصوصیت سے درخواست کروں گا کہ جو کچھ میں اب پیش خدمت کرنے والا ہوں آپ اس پر غنڈے دل سے غور فرمائیے۔ میں شروع ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کے عقیدے کو زیر بحث نہیں لائوں گا۔ صرف واقعات تک محدود رہوں گا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحی خداوندی یہ تمام و کمال قرآن مجید کے اندر جمع ہو گئی۔ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور اس طرح دین کی کیمبل ہو گئی۔ لیکن بعد میں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی خداوندی تمام قرآن مجید میں درج نہیں ہوئی۔ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک قسم کی وحی قرآن مجید میں درج ہوئی۔ دوسری قسم کی وحی احادیث میں۔ یہ دونوں قسم کی وحی قرآن ہی میں کیوں نہ جمع کر دی گئیں اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔ (تفہیمات - جلد اول - ص ۲۳)

## احادیث کے مجموعے

وکی کا یہ حصہ امت تک کس طرح پہنچا یہ بات غور طلب ہے۔ اس مجموعے کو مرتب کر کے نہ تو رسول اللہ نے امت کو دیا اور نہ ہی صحابہ کیا کرنے ایسا کیا۔ قریب دو سو سال بعد ایسا کرنے کے کچھ ارباب غیبس و تحقیق اسٹھے اور لوگ جن زبانی روایات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے انہیں ان سے سن کر جمع کرنا شروع کیا۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں تھیں۔ انہوں نے ان میں سے چند ہزار کو قابل قبول قرار دیا اور باقی لاکھوں روایات کو مسترد کر دیا۔ مثلاً امام بخاریؒ نے چھ لاکھ روایات میں سے اسکو رات کو نکال کر صرف دو ہزار ستارہ ہاتھ روایات کو قابل قبول قرار دیا۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے تیرہ سو، ابو داؤد، ابن ماجہ اور نسائی نے بھی لاکھوں کے ذخیرے میں سے چند ہزار روایات کو قابل قبول قرار دے کر اپنے اپنے مجموعے تیار کئے۔ سنیوں کے ہاں ان چھ مجموعوں کو احادیث کی صحیح ترین کتابیں تسلیم کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان جامعین حدیث کے پاس وہ کون سا ذریعہ اور کون سی اتھارٹی تھی جس کی بناء پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ روایات ٹھیک ٹھیک رسول اللہؐ کی ہیں اور یہ وہی وہی اس لئے مسترد کر دینے کے قابل اظہار ہے کہ انہیں تو اس کا علم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور نہ ہی ان کے تجربوں کی تصدیق رسول اللہؐ نے فرمائی۔ وہ ان تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ ہر حال اپنے خیال کے مطابق کیا تھا۔

جب احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جن راویوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے ان کے متعلق تحقیق کیا جانا چاہیے کہ وہ قابل اعتماد تھے یا نہیں۔ اسے اسماء الرجال کا فن کہا جاتا ہے۔ اس فن کے ماہرین نے دو سو سال پہلے کے گزرے ہوئے اہل ان کے متعلق تحقیق کرنا شروع کیا کہ وہ کس حد تک قابل اعتماد تھے۔ اس قسم کی تحقیق کے بعد احادیث کے مختلف مدارج مقرر کئے گئے۔ صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع، موقوف، وغیرہ ہزار برس سے یہ مجموعے اسی طرح چلے آ رہے تھے کہ ہمارے زمانے میں ایک صاحب نے یہ دعوے کیا کہ احادیث کے پرکھنے کے یہ طریق اور ذرائع قابل اعتماد نہیں۔ اس کے لئے ایک اور ذریعہ ہے جس کی رو سے حتم و یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کون سی حدیث رسول اللہؐ کی ہے اور کون سی ایسی نہیں۔ وہ ذریعہ یہ ہے کہ

## مزاج شناس رسولؐ

جس شخص کو اللہ تعالیٰ توفیق کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور میریت رسولؐ کے فائز مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پیرا نے جوہری کی بصیرت کہ وہ جو اس کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے متا بہت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ وہ شخص نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کون سا قول یا کوئی فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبیؐ کے سامنے نالا مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ ارشادِ گرامی ہے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا جسے انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات جلد اول (۱۹۳۳ء) پر تحریر فرمایا ہے۔ اس معیار کی رو سے آپ کو "مزاج شناس رسولؐ" کی نگہ بصیرت پر ایمان لانا ہوگا یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ جس بات کے

متعلق وہ کہہ دے کہ وہ ارشاد نبوی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے۔

یہ ہے ان احادیث کی تاریخ لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے :-

تحقیق و تنقیح کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار

کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا .... جو احادیث قواعد صحیحہ اور

آئمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ص ۱۴۱ از مولانا محمد اسماعیل مرحوم سابق صدیقیت اہل حدیث)

”کفر اور ملت سے خروج“ کے الفاظ سے آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیے جس شخص پر کفر اور ملت سے خروج کا فتویٰ عام نہ

دیا جائے اسے مرتد قرار دے دیا جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان احادیث میں سے

کسی ایک حدیث کے انکار کا عملی نتیجہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے میں اس وقت عقائد سے بحث نہیں کر رہا ہوں۔

میں بخاری شریف سے دو ایک ایسی حدیثیں پیش کر رہا ہوں کہ ان کی اجازت چاہوں گا جن کا تعلق معلومات عامہ سے ہے۔ ایک

حدیث ہے :-

بخاری کی احادیث | نبی نے بغداد سے جب کہ آفتاب طلوع ہوا تھا، یہ فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ

کہا جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب واقف ہے۔ آپ نے فرمایا

کہ وہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے۔ پھر اللہ سے اجازت طلوع کی مانگے گا تو اسے اجازت طلوع

کی دی جائے گی۔ اور قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کا سجدہ قبول نہ کیا جائے اور اجازت مانگے اور اسے

اجازت نہ ملے۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں لوٹ جا۔ پس وہ مغرب سے طلوع کرے گا۔

(بخاری اردو ترجمہ - جلد دوم - ص ۱۳۲)

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث ہے کہ

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پورے دنگار سے شکایت کی کہ اے میرے

پروردگار! میرے ایک جھٹلے میرے دوسرے جھٹلے کو کھالیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دوسرے سانس

لینے کی اجازت نہ دی۔ ایک سانس جاڑوں میں اور ایک سانس گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے

جہہ یہ بھی جہنم کا سانس ہے (بخاری اردو ترجمہ - جلد دوم - ص ۱۳۲)

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سورج کا طلوع و غروب اور موسموں کا تغیر و تبدل زمین کی گردش کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس

سے ان احادیث کا انکار لازم آئے گا۔ اس انکار کا نتیجہ کفر اور ملت سے خروج ہوگا جس کا نتیجہ ارتداد اور ارتداد کی سزا

قتل ہے۔ اس سے آپ خوفِ ارتداد کا اندازہ لگا لیجئے۔

جہاں تک احکام شریعت کا تعلق ہے، عقیدہ یہ ہے کہ احادیث میں جو احکام درج ہیں وہی اسلامی احکام ہیں۔ ان

میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو قرآن کے کسی حکم کے خلاف ہو تو حکم حدیث کا نافذ ہوگا

قرآن کا نہیں کیونکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ (فقہ انکار حدیث از علامہ حافظ محمد ابوبکر مرحوم ص ۱۳۲)

حدیث سے آگے بڑھ کر فقہ کی طرف آئیے۔ بعض قانون دان حضرات نے یہ کہا کہ قرآن تو ایک طرف جو احکام احادیث



یہ بھی درست ہے وہ بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے خود قوانین وضع کئے اور کہا کہ قرآن اور حدیث کے تمام احکام ان قوانین کے اندر آ گئے ہیں۔ اور یہ اسلام کے لئے کافی ہیں۔ انہیں امر فقہ کہتے ہیں جن میں سے چار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔ ان فقہی قوانین کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں ایسے قوانین بھی ہیں جو قرآن کے بھی خلاف ہیں اور بعض احادیث کے بھی خلاف۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ ہے کہ حکم بہر حال فقہ کے قوانین کا نافذ ہوگا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مفسر امام ابوالحسن علیہ اللہ الکریم کا قول ہے کہ

**فقہ** ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو منسوخ ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہر وہ بھی منسوخ ہے۔

(تاریخ فقہ اسلامی - شائع کردہ دارالمعتنفین اعظم گڑھ ص ۴۲)

ہمارے ہاں حال ہی میں جو چند قوانین "شرعی حدود" کے نام سے نافذ کئے گئے ہیں ان کا تعلق فقہ حنفی سے ہے۔ مطالبہ بیکیا جاتا ہے کہ یہاں پولی کی پوری فقہ حنفی کو پہلک لانا کے طور پر نافذ کر دیا جائے۔ واضح ہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے قیود بھی الگ ہیں اور ان کی فقہ بھی الگ۔ وہ فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ سینوں میں اہل حدیث بھی فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں حنفی ہیں لیکن ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک نہیں پڑھتے۔

فقہ کے یہ احکام ان لوگوں کے مرتب کردہ ہیں لیکن جب یہ نافذ ہوئے تو مودودی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہمارا سلیقہ یہ ہے کہ

عوام الناس کو یہ احساس دلانی کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۹ء ص ۳۱

آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت کس طرح اپنے فیصلوں کو خدا کے قوانین کہہ کر نافذ کرتی ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے دوسرے مقام پر کہا کہ

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

(ایشیا۔ مؤرخہ ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء ص ۹)

دنیاوی سراجی اور خدا کا غضب بھی! آپ نے خوف اور حزن کی شدت کا اندازہ لگایا؟

یہ ہے وہ مقام جس پر امت آج کھڑی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ وہ صدیوں سے اسی راستے پر گامزن ہے قرآن نے کہا تھا کہ حکومت صرف خدا کی ہوگی جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ سیاسی حکومت ہو یا مذہبی پیشوائیت ان میں قرآن کریم کا کوئی عمل اور دخل نہیں۔ سب ان لوگوں کے مرتب کردہ قوانین ہیں اور وہ بھی ہر بار برس پہلے کے۔ ان لوگوں کے ان وضع کردہ احکام شریعت سے خوف اور حزن کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ ایک شخص غصے



کی حالت میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے طلاق، طلاق، طلاق۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا جاتا ہے تو وہ مولوی صاحب کے پاس فتویٰ لینے کے لئے جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا نکاح ٹوٹ چکا ہے۔ اب اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں کہ تمہاری بیوی کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ رات بسر کرے۔ پھر وہ اسے طلاق دے دے تو تمہارے ساتھ اس کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اس فتویٰ سے اس خاوند پر جو **طلاق۔ طلاق۔ طلاق** گزرتی ہے اسے تو چھوڑ دیتے۔ اس بے گناہ بیوی کی کیفیت کو سامنے لائیے۔ میرے پاس اس قسم کے میاں بیوی اکثر آتے رہتے ہیں۔ وہ عصمت مآب خاتون پانچ چھ بچوں کی ماں ہے۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اداس فتویٰ کے تصور سے اس پر غش کے ددر سے پڑ رہے ہیں۔

بیوی پر طلاق پڑنے کی صورت یہی نہیں کہ خاوند طلاق، طلاق، طلاق کہہ دے۔ ان حضرات کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے خلاف یہ کفر کا فتویٰ صادر کر دیں اس کی بیوی پر اخذ طلاق پڑ جاتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ تمام مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ اس معیار کی رو سے دیکھیے تو دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں رہتا جس کی بیوی پر طلاق نہ پڑ چکی ہو۔ یہ بات فرقوں تک محدود نہیں۔ مشاہیر امت میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو۔ مثلاً قائد اعظم محمد علی جناح کو لیجئے۔ غلام احمد کے مولانا مظہر علی اظہار دہلوی کے مولانا حسین احمد مدنی نے انہیں کافر اعظم کے فتویٰ سے نوانا۔ بریلوی فرقہ نے تفصیلی فتویٰ صادر فرمایا جس میں کہا :-

بحکم شریعت مسٹر جیٹا اپنے ان عقائد کفریہ، قطعیہ، جنتیہ کی بناء پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے جو شخص اس کے کفر و پر مطلق ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک نہ کرے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد اور شرالانام اور بے توبہ مرآتو مستحق لعنت عزیر العالم ہے۔  
(تجانب اہل السنۃ ص ۱۲۷)

یہ تو رہا قائد اعظم کا (معاذ اللہ) کافر اور مرتد ہونا۔ اس کے بعد دوسرے فتویٰ میں کہا گیا کہ جو شخص قائد اعظم کو کافر اور مرتد نہ سمجھے اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی۔ (فتویٰ مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور)  
ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مذہبی پیشوائیت کی جسکڑائی کا کیا عالم ہے اور اس کے تابع امت کس قسم کے جگر سوز خوف اور حزن کا شکار چلی آ رہی ہے۔ ان کے اس قسم کے فتوے احکام خداوندی کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو قوم اتنی صدیوں سے ایک طرف مودنی باورثا ہوں کے پیچھے استبداد میں جھک چکی ہو اور دوسری طرف اس قسم کے احکام شریعت کی پابندیوں میں محصور اس کی قلبی اور ذہنی کیفیت کس قسم کی ہوگی اور وہ کون سا نفسیاتی مرض ہوگا جس کا وہ شکار نہ ہوگی؟ اقبالؒ نے امت کے اس بنیادی مرض کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔  
چوں خلافت رشتہ از قرآن گنجست حریت راز ہر اند کام ریخت (اسرار و رموز ص ۱۲)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و متین کس بسنن نطق! مومن و غدار و فقر و نفاق!  
پاشینرے دین و ملت و فرخت ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت

ہماری نیلوی حالی

لا الہ اندر نماز کش بود و نیست      نماز با اندر نماز کش بود و نیست  
نور در صوم و صلوات او تماند      صلوات در کائنات او تماند  
روح چوں رفت از صلوات از صیام      فردا سہوار و ملت بے نظام  
سینہ با از گریستہ آں تہی      از چین مرداں چہ اُمید بہی

ہر کسے بر جادۂ خود تند زد      ناقد ما بے نام و ہند زد (جاوید نامہ صفحہ ۷۳۵)

سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ”شفاع المانی الصدور“ کہا ہے۔ لہذا اگر ہمارا اس پر ایمان ہے تو یہی ہمارے لئے شفاء شفا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحسوس دل کی      علاج اس کا وہی آپ نشاط انگیز ہے ساقی (ہالی جبریل)  
اس سے بھی واضح تر الفاظ میں :-

حمر تو میخوای مسلمان رست      نیست ممکن جسد بقرآن زیستن

”جو قرآن کے معنی والا اللہ کے ہیں۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے لا الہ الا اللہ ہے۔ یعنی انہوں نے وضع کردہ تمام آئین و مسامیر و قوانین و احکام سے قطع نظر خالص کتاب اللہ کی حکومت پر آپ دیکھئے کہ اس کا علاج قرآن کریم میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حشر کا میدان ہے۔ تمام قومیں ایک ایک کر کے اپنے اپنے رسول کے زیر شہادت یا رگاہ خداوندی کے سامنے سے گزر رہی ہیں جب ہماری

باری آتی ہے تو حضور نبی اکرمؐ پکار کر کہتے ہیں۔ یا سرت رات قومی الخد کواھل انظر ان مہجور (دیکھ) ”اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا“ دیکھئے! رسول اللہؐ یہیں فرماتے کہ میری امت نے بخدا اور مسلم کو چھوڑ دیا تھا یا ہدایا اور درالختار (فقد کی کتابوں) کو۔ وہ فرماتے ہیں تو یہ کہ اس قوم نے قرآن کو ترک کر دیا تھا حضورؐ نے اپنی امت کو قرآن ہی سے متمسک رہنے کی تاکید فرمائی تھی اور آپ قرآن ہی کو ترک کرنے والوں کے خلاف الزام عائد کریں گے اس لئے امت کے اسلاف کے ازالے کی صورت قرآن ہی سے متمسک ہونے میں ہے۔ تمسک بالقرآن کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے ہاں فقہ اور حدیث کا جو ذخیرہ چلا آ رہا ہے (معتبر ضمیمہ کے الفاظ میں) اسے دریا برد کر دیا جائے بمقصد یہ ہے کہ دین میں سدا اور محبت خدا کی کتاب کو تسلیم کیا جائے اور اسی کو حفظ اور صحیح کامیاب قرار دیا جائے۔ اس کے غیر متبادل قوانین و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں اور ایسا کرنے میں اس تمام لشکرِ کچر سے مدد لی جائے جو ہمارے ہاں شوارت چلا آ رہا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے رہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔ (چٹا خطبہ ص ۱)

شرعیات کے معنی | ہمارے ہاں شریعت کا لفظ تو سہرا ایک کی زبان پر جوتا ہے لیکن اس کے معانی پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ عربی زبان میں شریعت اس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کے گھاٹ کی طرف لے جائے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ پانی پہنچنے والا (آپ دواں) ہو۔ ایک مقام پر بحث ہو (جو پڑ بآلاب) نہ ہو۔ اگر پانی ساکن ہے تو عرب اس راستے کو شرط نہیں کہیں گے، کوئے کہیں گے۔ لہذا جو طریق عمل جاری ہو کر رہ جائے اور زمانے کے دواں دواں تقاضوں کا ساتھ نہ دے اسے ”شریعت“ کی راہ کہا ہی نہیں جائے گا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی مد سے کسی انسان یا انسانوں کے گرد کو حق حکومت حاصل ہی نہیں حق حکومت صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے اور چونکہ اس کتاب میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں اس لئے اس کی حکومت اختیار کرنے میں انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے آزاد اور مامون ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مَنَی قَحْلَهُ کَانَ آمِنًا (پہلے جو اس نظام حکومت میں داخل ہو گیا اسے ہر قسم کا امن نصیب ہو جائے گا۔



زیر نظر موضوع تو اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے لیکن آخر میں میں ایک اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو نہ مہربانہ ہو جو انہوں کی طرف سے اکثر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے آخری دین بنا کر دینا سے ظلم اور استحصال کا خاتمہ ہوا ورنہ ان انسان و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ ظلم ہی اسی طرح سے ہماری ہے اور استحصال بھی مظلوم آج بھی اسی طرح پس رہے ہیں اور کسی کو اطمینان نصیب نہیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر اس دین کا فائدہ کیا ہوا اور اسلام نے اگر کیا کیا اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کے ذہن میں تصور یہ ہوتا ہے کہ اسلام کسی شخص کا نام ہے جسے خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ وہ ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف رائج کر دے۔

## ایک اعتراض کا جواب

اسلام کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ جیسا کہ میں نے اس خطاب کے آغاز میں کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم ایک نسخہ عطا کر رہے ہیں جس کے استعمال سے انسانیت کے امراض کو شفا مل جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ شفا قیامی صورت میں ملے گی جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے۔ اگر اس نسخے کو حفاظت سے لپیٹ کر رکھ لیا جائے تو اس سے مرہن کو شفا نہیں ہو سکتی۔ اعتراض اس صورت میں حق بجانب قرار پاسکتا ہے جب اس نسخے کو استعمال کیا جائے اور اس کے باوجود بعض اچھا نہ ہو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ آج کل اسلام کے لئے دنیا میں اتنا کچھ کیا جا رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان افراد کو دیکھئے یا اقوام کو سب اپنی زبوں حالی کے مرثیہ خواں نظر آتے ہیں۔ اس کا بھی اس کے سوا کیا مطلب لیا جائے گا کہ اسلام تو انسان تو ایک طرف خود مسلمانوں کی حالت سنوارنے میں بھی ناکام رہا ہے۔ اسے بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ ایک ریل گاڑی غلط کانسٹریکشن سے دو سرے پٹری پر جا پڑی۔ اس ریل گاڑی کے انجن کی رفتار تیز کرنے کے لئے جو کچھ کیا جائے گا اس سے اس کی رفتار تو تیز ہو جائے گی لیکن وہ جتنی آگے بڑھے گی اتنی ہی اپنی حقیقی منزل سے دور پڑتی چلی جائے گی۔ مسلمانوں نے جس وقت خدا کی حکومت کو چھوڑ کر انسانوں کی حکومت اختیار کی ان کی گاڑی غلط پٹری پر جا پڑی۔ اب جو کچھ اسلام کی ترقی اور فروغ کے نام سے کیا جاتا ہے وہ غلط پٹری پر پڑی ہوئی ریل گاڑی کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جس قدر یہ گاڑی آگے بڑھتی ہے قرآنی منزل سے دور پڑتی چلی جاتی ہے۔ جب تک اس گاڑی کو اس مقام پر واپس لا کر جہاں سے یہ غلط کانسٹریکشن تھی اسے صحیح پٹری پر نہیں ڈالا جائے گا یہ اپنی منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔ وہ صحیح پٹری ہے لا الہ الا اللہ اور منہدی مقصود ہے لا خوف علیہم ولا هم یحزنون۔

اقبال کے الفاظ میں :-

برخور از مسترآن اگر خواہی ثابت  
در ضمیرش دید ام آب حیات

(مثنوی مسافرۃ)

فی دہ مارا پیام لاتخفت  
فی رساند بر مقام لاتخفت

## مفسر کا حزن

میں نے اپنے خطاب میں اُس حزن کے متعلق کچھ نہیں کہا جو سب سے زیادہ دل سوز اور جگر پاش ہے۔ جو اب ان کو اُس تپتی  
میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی حرارت کوئی تھراپیٹر یا کیکر نہیں کر سکتا لیکن جو ہڈیوں تک کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ یہ  
وہ حزن ہے جس میں دنیا کی کم، کم نفع آوری مبتلا ہے اور جس کا کوئی علاج کسی کو نہیں سمجھتا۔ یہ حزن ہے روٹی کی محتاجی کا پیدا کردہ۔  
یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ عربی زبان میں حزن اس پریشانی کو بھی کہا جاتا ہے جو افلاس اور محتاجی کی پیدا کردہ ہو۔ چنانچہ عرب "محتاجانہ  
للدجل" انسان کے ان متعلقین (بیوی بچوں) کو کہتے ہیں جن کی روٹی کی فکر سے وہ پریشان ہو۔ عربی لغت کی مستند کتاب تاج العروس  
میں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جنت کے متعلق کہا گیا ہے: "أَلْحَمْدُ لِلَّهِ الْعَاجِیْ اذْهَبَ عَنْكَ الْحَزْنَ" (پہلے) تو اس سے مراد  
یہ ہے کہ قابلِ حمد و ستائش وہ ذات ہے جس نے ہمیں فکر و معاش سے نجات دلائی۔ لَایَمَسُّنَّاهُ قَبْلَ أَنْ یَمَسُّنَّاهُ  
لَعُوبٌ (پہلے) اس نے ایسا نظام قائم کر دیا ہے جس میں نہ ہمیں رزق کے لئے جگر پاش مشقیں اٹھانی پڑتی ہیں اور نہ ہی ذہنی  
کاوش اور نفسیاتی افسردگی کا شکار ہونا پڑتا۔ قرآنی معاشرہ میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق میں گزشتہ  
چالیس سال سے اس نکار و اصرار سے کھڑا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ نظام ربوبیت (یعنی قرآن کا  
معاشی نظام) میرے مہین کا بنیادی موضوع ہے۔ (اس موضوع پر میری جامع تصنیف کا نام بھی "نظام ربوبیت" ہے) میں اس  
وقت اس کے متعلق چند اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

(۱) اس نظام میں ہر فرد کو روٹی کی نگاہ میں کرنی پڑتی ہے اس میں تمام افراد معاشرہ کو بنیادی ضرورت یا بنیادی چیز کے  
ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔ دراصل اعلان کرتی ہے کہ "نَحْنُ حَتَمًا فِکْمُکُمْ وَ اِیَّاهُمْ" (ہم تمہاری ضروریات زندگی کے  
بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

(۲) اس میں اجراء و دستاویز (EMPLOYER AND EMPLEE) - مزدور اور کارخانہ دار کا شکار اور زمیندار کی آویزش کا سوال ہی پیدا  
نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور اپنی محنت کے حاصل میں سے بقدر اپنی ضرورت کے لیکر باقی سب  
دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مسکن کی تحویل میں دیدیتا ہے۔

(۳) اس طرح اس میں کسی کے پاس دولت جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا مسئلہ۔

(۴) اس میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ وہ تمام انسانوں کے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے نظامِ خداوندی  
اس کا ایسا انتظام کرتا ہے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

(۵) اس میں جو لوگ کسی وجہ سے محنت کرنے سے محروم ہوں انہیں خیرات نہیں دی جاتی۔ وہ اپنی ضروریات زندگی اپنے حق کے طور  
پر (AS OF RIGHT) حاصل کرتے ہیں۔ "فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا عَمِلُوا لِنَفْسِهِمْ اُولَئِکَ الَّذِیْنَ یَرْجُوْنَ" (پہلے)

(۶) چونکہ اس نظام میں نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہوتی ہے نہ زمینوں کے مرچنے اس لئے اس میں (TAXES)  
کے مسائل پیدا ہونے میں نہ رونا (سود یا منافع) کے۔ نہ زمینوں کے جھگڑے اٹھتے ہیں نہ جائیدادوں کے۔ یہ تمام مسائل اس اسلام کے پیدا کردہ ہیں جو  
ہمارے دور و سربلندی کے زمانے میں وضع ہوا تھا۔ قرآنی نظام میں نہ کوئی بھوکا سوتا ہے نہ ضرورت زیادہ اٹھتا۔ یوں اس نظام میں نہ کسی کو کسی  
قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ اقبال نے اس نظام کی انفرادیت کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست  
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

ذکوئی محتاج نہ سائل۔ نہ آقا نہ غلام۔ نہ حاکم نہ محکوم۔

فرمائیے! اس نظام میں خوف اور حزن کا شائبہ کبھی باقی رہ سکتا ہے؟ اور جب خوف و حزن باقی نہیں رہتا تو ان سے پیدا شدہ نفسیاتی  
امراض کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے معاشرہ سے اخلاقی و مذہبی جرائم ختم کرنے کا مستعدی نسخہ! والسلام